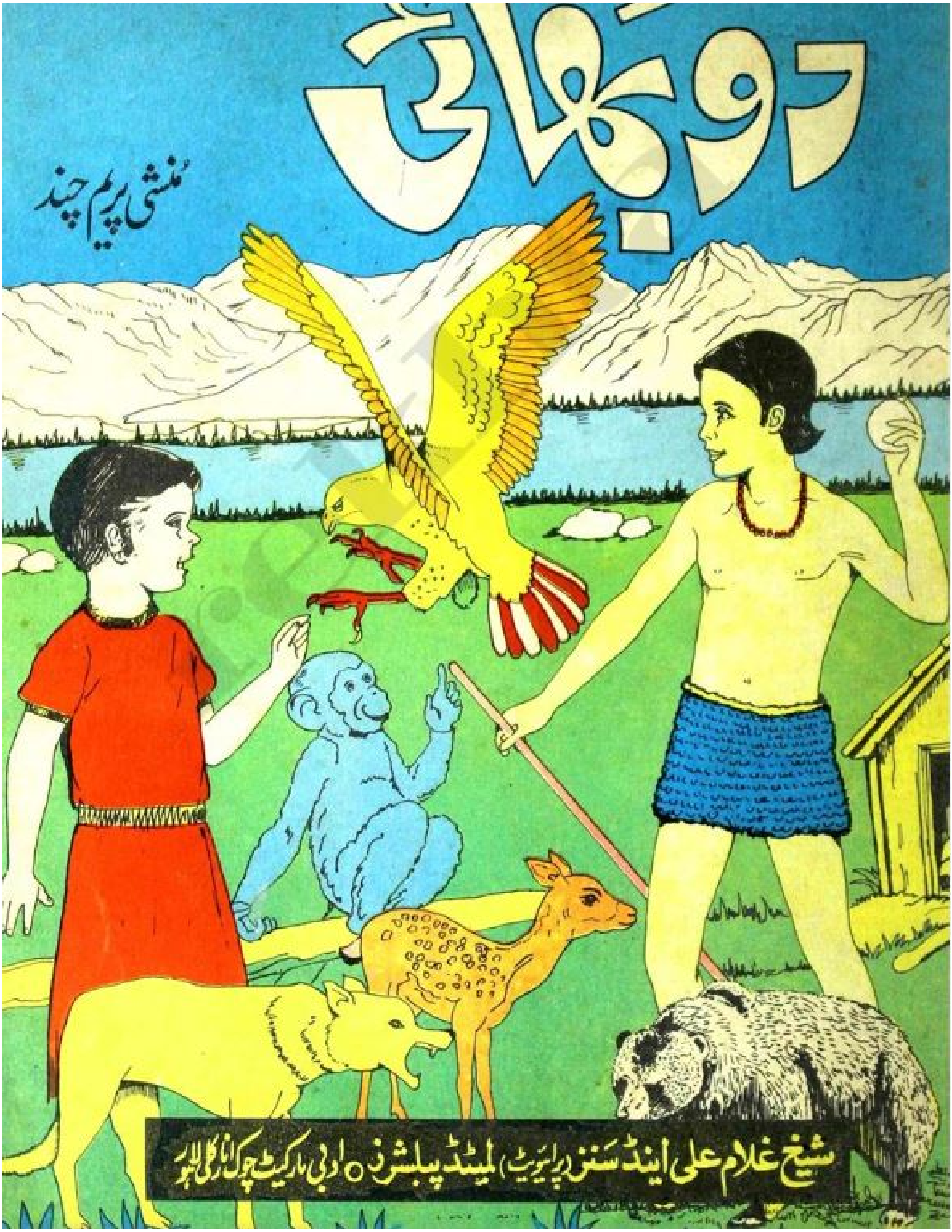


دو بھائی
منشی پریم چند
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز ٥ ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

پیارے بچو!

پہلے آپ مُنہ بولتی کہانی کے عُنوان سے ہلکی پھلکی کہانیوں کی سِلسلہ وار سیریز خوب چٹخارے لے کر پڑھ چکے ہیں ——— لیجیے! اب عجوبہ کہانی کے عُنوان کے تحت پہلے کی نسبت ذرا مشکل الفاظ میں ہمارے بزرگ ادیبوں کی کہانیوں کا نیا سلسلہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ عجوبہ کہانیاں آپ کو ایک نئی سوچ دیں گی ——— ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ہمارے بزرگ ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے آپ کے لیے خوبصورت انداز میں پیش کر کے اُسی طرح لوٹا دیں۔ یہ کہانیاں آج بھی آپ اُسی طرح پسند کریں گے، جس طرح کہ پچاس سال پہلے ہمارے بزرگوں نے اِنھیں پڑھا اور پسند کیا اور ان کے ذہنوں میں نقش کر گئیں انشاءاللہ آپ بھی پڑھیں گے تو اسی طرح کا لطف اُٹھائیں گے۔

اِن کہانیوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا، جو ہمارے لیے اور خاص کر آپ کے لیے ایک وراثت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج یہ وراثت ہم آپ کو ایک خوب صورت انداز میں لوٹا رہے ہیں۔ کہانیوں کو یکجا کتابی صورت میں کرتے وقت انتہائی مجبوری کے تحت دوسرے ساتھی ادیبوں کی کہانیاں بھی کتاب میں شامل کرنا پڑیں جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ البتہ ہر کہانی کے ساتھ ان کا اسمِ گرامی اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ آخر میں ان ادیبوں اور جو بزرگ ادیب ہم میں موجود نہیں، اُن کے لواحقین کی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے اِس قیمتی تحفہ کو آپ تک پہنچانے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ خاص طور پر محترم رب نواز ملک کا بھی جن کے دلی تعاون سے یہ کہانیوں کا خوب صورت گلدستہ آپ تک پہنچا۔

شیما مجید

مرتّبہ
شیما مجید

منہ بولتی کہانی ۷

301

منشی پریم چند

دو بھائی

صُبح کے وقت آفتاب کی تیز مگر سُہانی سنہری دُھوپ میں جسودا صحن میں بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے زانوؤں پر بٹھا رکھا تھا اور اُنھیں دُودھ اور روٹی کھلاتی تھی۔ ان میں سے کرشن بڑا تھا اور بلرام چھوٹا۔ وہ مُنہ میں لُقمے لیتے تھے اور پھر کئی قدم اُچھلتے تھے اور پھر زانوؤں پر آ بیٹھتے تھے اور پھر اپنی توتلی بولی میں موزوں فِقروں کی رٹ لگاتے۔

ماں انھیں پیار سے چمکار کر بُلا لیتی اور پھر بڑے بڑے لور کھلاتی۔



اس کے دل میں محبّت کا بے پناہ سُرور تھا اور اس کی آنکھوں میں غرُور کی جھلک۔ موتی تہہِ آب میں تھا اور حباب لہروں کے اُوپر۔

دونوں بھائی جوان ہوتے رہے ...... ساتھ ساتھ گلے میں باہیں ڈالے کھیلتے رہے۔

کرشن بہت سمجھ دار اور ذہین تھا ...... اور بلرام بہت طاقت ور تھا ...... دونوں بھائیوں میں اتنی محبت تھی کہ ساتھ ساتھ اسکول جاتے مگر اکیلے مٹھائی نہ کھاتے تھے۔

دونوں بھائی جوان ہو گئے تو دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔ کرشن کی بیوی بہت زیادہ باتیں کرنے والی اور چنچل تھی۔ اس کی ہرن جیسی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ کرشن کی اس پیاری سی دُلہن کا نام رادھا تھا۔

بلرام کی بیوی کا نام شیاما تھا۔

شیاما سانولی سلونی مناسب قد و قامت والی لڑکی تھی۔

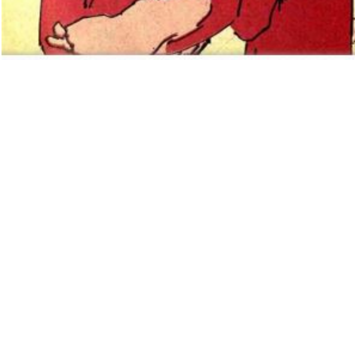
وہ بہت موٹی عورت تھی لیکن اس کی زبان بہت میٹھی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ اور کم بات کرنے والی عورت تھی۔ لہٰذا وہ اپنے ہی حال میں مست رہتی تھی اور بہت کم کسی سے بولتی تھی۔



مگر کرشن اور بلرام کی ماں کا دل کسی سے نہ ملا۔ وُہ اپنے دونوں بیٹوں اور اُن کی بیویوں سے خوش بھی تھی اور دونوں سے ناراض بھی تھی۔

دونوں بھائی صاحبِ اولاد ہو گئے۔ دونوں ہی بہت خوش تھے۔ تناور درخت خُوب پھیلا اور پھلوں سے لد گیا...... چھریرے درخت میں صِرف ایک ہی پھَل نظر آیا۔ مگر وُہ بھی کچھ زرد زرد سا اور مُرجھایا ہُوا۔ لیکن دونوں بھائی تقدیر کے شاکی تھے۔ کیوں کہ بلرام کو دولت کی ہوس تھی اور کرشن کو اولاد کی تمنّا تھی۔

تقدیر کے ساتھ ہر وقت اس شکوہ شکایت نے رفتہ رفتہ رشک کی صُورت اختیار کر لی، جو بالآخر حسد کا پیش خیمہ تھی۔



شیاما اپنے بچّوں کی پرورش اور دیکھ بھال میں مشغول تھی۔ اُسے تو سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

دُوسری طرف غریب رادھا کو چُولھے میں جلنا اور چکّی میں

پِسنا پڑتا تھا۔

یہ کوفت، یہ جلن کبھی کبھی ناخوشگوار الفاظ میں ظاہر ہوتی۔ شیاما سُنتی، کُڑھتی اور ضبط کر کے رہ جاتی، مگر اس کا ضبط وہ خموشی تھی، جو ساہوکار کے تقاضوں کو روز بروز سختی کی جانب مائل کرتی تھی۔

یہاں تک کہ آخرکار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہرن راہِ فرار نہ پا کر شکاری کی جانب لپکا۔ غصّہ اور لڑائی کے لیے سینگیں جُھکائے رادھا اور شیاما زاویہ بنانے والے خطوں کی طرح علیحدہ ہوگئیں۔

کئی سال گزُر گئے!

دونوں بھائی کرشن اور بلرام جو ایک ہی تھالے میں کھاتے تھے اور ایک ہی ماں کی چھاتی سے دُودھ پیتے تھے انھیں اب ایک گھر میں اور ایک گاؤں میں اکٹھے رہنا بھی شاق تھا۔

مگر خاندان کی ساکھ قائم رہے۔



اس لیے اس رشک وحسد اور دشمنی کی دہکتی ہُوئی اِس آگ کو راکھ کے نیچے دبا کر چھُپانے کی کوشش ہوتی تھی۔

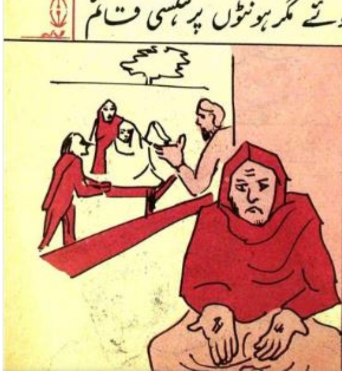
ان کی ماں ابھی زندہ تھی!

بدنصیب اور دُکھوں کی ماری جسوَدا دونوں بیٹوں کی دن بدن بڑھتی ہُوئی حسد کی اِس آگ کو دیکھتی تھی تو اندر ہی اندر کُڑھتی تھی اور خُون کے گھُونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔ اُس کے دل میں محبّت وُہی تھی، مگر اب اس کی آنکھوں میں غرور نہ تھا... پھُول وہی تھا مگر شگفتگی رخصت ہو چکی تھی۔

بے چارے بلرام کا حال تباہ ہو چکا تھا۔ زیادہ بال بچّے، تھوڑی آمدنی، اس پر وضع داری کا نباہ۔

دل چاہے اندر سے روتے روتے مگر ہونٹوں پر ہنسی قائم رہنی چاہیے۔ سینہ چاہے تمام داغ داغ ہو، مگر کپڑے ہرگز مَیلے نہ ہوں۔

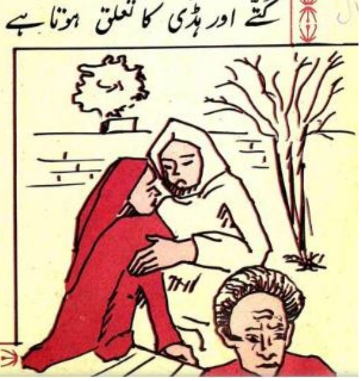
بلرام کی چار لڑکیاں تھیں اور ضروریاتِ زندگی اتنی مہنگی کہ چند پائیوں کی زمینداری کہاں تک



اسے سنبھالتی۔ لڑکوں کی شادی تو خیر اختیاری تھی، مگر لڑکیوں کی شادی کیسے ٹلتی۔ دو پائی زمین لڑکی کی شادی کی نذر ہو گئی..... اس پر بھی گھر میں آئے ہوئے باراتی لوگ صحن سے اُبلے ہوئے چاول کھاتے بغیر اُٹھ گئے۔

دُوسری لڑکی کا بیاہ تو بالکل کچّے دھاگے کی گانٹھ کی طرح تھا۔ شیاما نے جب دُولھا کو دیکھا تو بھرے آنگن میں خُوب پھُوٹ پھُوٹ کر روئی۔

ایک سال بھی نہ گُزرا تھا کہ تیسری لڑکی کی شادی کا مسئلہ سامنے آن کھڑا ہُوا۔ اس بار پیڑ پتّے بھی نہ بچے۔ یُوں تو ہال ڈال بھرپُور تھی...... مگر تنگ دستی اور امانت میں تو گُتّے اور ہڈّی کا تعلق ہوتا ہے........ دو سال کی لگان ادا کرنا باقی تھی۔



لڑکی کے زیورات گروی رکھے گئے، گلا چھُوٹا۔

رادھا تو غالباً اِسی موقعے کی تلاش میں تھی اور انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے فوراً ہی

رشتہ داروں کے یہاں خبر بھیجی کہ تم لوگ یُوں ہی غافل بیٹھے رہو اور یہاں زیوروں کا صفایا کیا جا رہا ہے۔

تیسرے ہی دن ایک نائی اور دو براہمن بلرام کے دروازے پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس غریب کی گردن میں پھانسی آن پڑی۔ اِتنا روپیہ کہاں سے آتے...... نہ زمین اور جائیداد، نہ باغ باغیچہ۔ اس کا اعتبار بھی کب کا اُٹھ چُکا تھا۔

اس کے پاس اب اگر کوئی جائیداد تھی تو صِرف وُہی دو عدد کوٹھڑیاں ہی تو تھیں جن میں اس نے اِتنی عُمر گزاری تھی۔ اور ان کو خریدنے کے لیے کوئی گاہک نہ تھا۔

اُدھر تاخیر اور ٹال مٹول کرنے میں ناک کٹتی تھی۔ وہ سخت پریشان تھا۔ مجبُور اور لاچار ہو کر اپنے بھائی کرشن کے پاس آیا اور اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے بولا:



"بھیّا کرشن! مَیں اِس وقت سخت پریشان ہُوں، اور بڑی مُشکل میں ہُوں۔ تم میری کچُھ مدد کرو۔"

کرشن نے جواب دیا :

" بلّو ! بھائی میرے ، آج کل میں بھی سخت تنگ ہو رہا ہوں۔ تم سے سچ کہتا ہوں ۔"

رادھا نے مالکانہ انداز میں مداخلت کی :

" ارے .... تو کیا اب تم اِن کے لیے بھی تنگ ہو رہے ہو ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ..... الگ کھانا کھانے سے کیا عزّت بھی الگ ہو جاتے گی ؟"

کرشن نے اپنی بیوی کی طرف شرمسار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دبے لہجے میں کہا :

" نہیں .... نہیں ، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا ۔ ہاتھ تنگ ہے تو کیا ۔ کوئی نہ کوئی فکر تو کرنا ہی پڑے گی ۔"



رادھا بولی :

" ایک سو روپے سے کچھ اُوپر ہی گہنے رکھے تھے ۔"

بلرام نے جواب دیا :

" ہاں ، سُود ملا کر کوئی سوا سو روپے بنتے ہیں ۔"

کرشن اس وقت ہندوؤں کی مقدّس کتاب بھگوت گیتا پڑھ رہے تھے ، پھر پڑھنے میں غرق ہو گئے ۔ رادھا نے پھر معاملے کی بات شروع کی :

" روپیہ تو بہت ہے ۔ ہمارے پاس ہوتے تو کوئی بات نہ تھی ، مگر ہم کو بھی دُوسرے سے دلانا پڑے گا ، اور مہاجن بنا لکھائے پڑھائے روپیہ دیتے نہیں۔"

بلرام نے سوچا اگر کچھ لکھانے پڑھانے کے لیے اس کے پاس ہوتا تو کیا اور مہاجن مر گئے تھے ۔ تمھارے دروازے پر آتے ہی کیوں ؟ وہ بولا :

" رادھا بھابی ! لکھنے پڑھنے کے لیے میرے پاس رکھا ہی کیا ہے ؛ جو کچھ جائیداد ہے ، وہ یہی گھر ہے ۔"



رادھا اور کرشن نے ایک دُوسرے کو مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ۔ کیا آج سچ مچ زندگی کے سارے ارمان نکلیں گے ، اور یہ کم بخت شرارتی گھر سے باہر ہو گا .... مگر پھر اس

رُوحانی خوشی نے اس کے چہرے تک آتے آتے فکر آمیز غرور کی صُورت اختیار کر لی۔

رادھا کہنے لگی :

"گھر پر شاید ہی کوئی مہاجن روپیہ دے اور سو سوا سو روپیہ اس زندگی میں ان دو کوٹھڑیوں کے کون دے گا ؟ ایک سو اگر تم چاہو تو ایک مہاجن سے دلا دُوں۔ باقی بیس روپوں کے لیے کہیں اور فکر کرو۔"

بلرام ایک احمقانہ ضد کے ساتھ اڑ گیا۔ بولا :

"گہنا زیور ہوتے تو کہتا کہ لاؤ اِنھیں گروی رکھ کر اپنا کام چلا لُوں.... مگر یہاں تو کچّا دھاگا بھی نہیں۔ اور پھر جب بدنام ہی ہوئے تو کیا دس کے لیے اور کیا پچاس کے لیے ،... دونوں طرح ایک جیسا ہی ہے۔ صرف نام کا خیال ہے..... ورنہ اگر مَیں ایک بار انکار کر جاؤں ، تو کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا۔ مزنا کیا نہ کرتا..... اور سچ پُوچھیے تو مجھے اپنے نام کی فکر نہیں۔ مجھے کون



جانتا ہے۔ سنسار تو بھیّا پر ہنسے گا۔"

کرشن کا چہرہ یہ سُن کر ایک دم زرد ہو گیا...... رادھا بھی گھبرا گئی۔

رادھا بولی :

"لالہ ، تم تو کبھی کبھی بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا اس جھونپڑی پر کون بے وقوف ہے جو سوا سو روپے نکال کر دے۔ تم سوا سو روپے کے بدلے میں سو روپے ہی دِلواؤ..... میں آج اپنا حِصّہ بیچتی ہُوں۔ گھر پر تو ہم کو وہی ایک سو روپے ہی ملیں گے..... ہاں اور روپے کی فکر خُود کریں گے.... عزّت ہماری تمھاری ایک ہے ، وہ نہ جانے پائے گی۔ تم فِکر نہ کرو۔ یہ روپیہ الگ کھاتے پر چڑھا دیا جائے گا۔"

بلرام کی خوشی کے مارے باچھیں کِھل گئیں۔ اُس نے میدان مار لیا۔

سوچنے لگا :

مجھے تو روپیہ سے کام ہے ، چاہے دس کھاتوں پر چڑھا لو...



رہا مکان، وہ جیتے جی چھوڑتا نہیں ہوں۔

اس کے جانے کے بعد رادھا اور کرشن نے اس طرح دل کو سمجھایا...... اب دیکھیں گے یہ شیاما رانی اِس گھر میں کیسے راج کرتی ہیں۔

ایک گود کے کھیلے ہوئے دونوں بھائی...... ایک ہی ماں کی چھاتی سے دُودھ پینے والے آج اتنے بے گانے ہو گئے ہیں کہ ایک گھر میں رہنے کے روادار نہیں...... کرشن کی ہنسی اس دن بجے گی جب غریب بلرام اپنے بال بچّوں کو لیے کہاں مارامارا پھرے گا اور کیا کرے گا۔

صبح کا وقت تھا، پرندے چہچہا رہے تھے!

کرشن کے دروازے پر گاؤں کے مُکھیا اور نمبردار جمع تھے۔



اور منشی داتا دیال بڑی شان و شوکت کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے رہن نامہ کا مسوّدہ مرتّب کرنے میں غرق تھے۔

داتا دیال نے پوچھا:

"راہن کا نام؟"

بڑے بھائی بولے:

"بلرام ولد باسدیو۔"

"اور مُرتہن کا نام؟"

"کرشن ولد باسدیو۔"

بلرام نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں کھُلی رہ گئیں۔ آنسوؤں کی قطار ٹپکنے۔ کرشن نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ نگاہ سامنے نہ ہوسکی۔ یہ انسان پر قدرت کی فتح تھی۔

نمبردار اور مختار اور مُکھیا سب چونکے۔ کیا کرشن خود ہی روپے دے رہا ہے؛ بات چیت تو کسی اور ساہُوکار کی تھی۔ جب گھر ہی میں روپیہ موجُود تھا تو اس رہن نامہ کی کیا ضرورت تھی؟ کیا بھائی بھائی میں اِتنا اعتبار بھی موجود نہیں۔ بُوڑھی ماں نے سُنا تو سُوکھی ندی اُمڈ آئی۔



اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا۔

بے اختیار بول اُٹھی:

"نارائن! کیا ایسے لڑکوں کو میری ہی کوکھ سے تُو نے جنم دینا تھا؟" ❊

سعید لخت

زمین کا بوجھ

کراچی سے ہماری ممانی جان آئی ہوئی تھیں۔ اُن کے ساتھ رینو بھی تھی، اُن کی چھوٹی لڑکی۔ ہم سے بس یہی سال دو سال چھوٹی ہو گی۔ بڑی شریر اور چنچل۔ آتے ہی سَر ہو گئی کہ چڑیا گھر دیکھنے چلو مگر ممانی جان کو عزیزوں اور رشتے داروں ہی سے فرصت نہ تھی۔ وُہ ٹالے جا رہی تھیں۔

اتوار کے دن ناشتے کی میز پر رینو مچل گئی:

"مَیں کہتی ہُوں .... آج تو مَیں چڑیا گھر جا کر ہی چھوڑوں گی۔ لو بھئی! چار دن ہو گئے آئے ہُوئے اور ابھی تک چڑیا گھر بھی نہیں دیکھا..... اگر کل کلاں کو مر گئی اور فرشتوں نے قبر میں سوال کیا کہ دس سطروں میں لاہور کے چڑیا گھر کا حال



لکھّو تو کیا جواب دُوں گی ــــــ؟"

"آج تو مَیں انور بھائی کے ہاں جاؤں گی۔" ممانی جان بولیں۔ "کل وَل کو دیکھا جائے گا۔"

"انور بھائی کے ہاں تو آپ سہ پہر کو جائیں گی امّی۔" رینو نے کہا۔ "چڑیا گھر اب چلیے۔ دوپہر تک واپس آ جائیں گے۔"

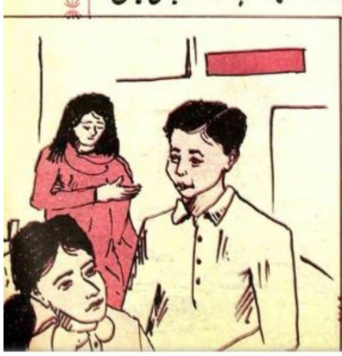
"انھیں رہنے دو رینو!" سیما بولی۔ "ہم تم چلتے ہیں۔ آخر اسکول بھی تو روزانہ ہم اکیلے ہی جاتے ہیں، اور پھر چڑیا گھر تو ہمارے اسکول سے بہت قریب ہے، اس کے علاوہ ماشاءاللّٰہ دس فٹ کا ایک پہلوان بھی ہمارے ساتھ ہو گا۔"

"وہ کون ــــــ؟" رینو نے پُوچھا۔

"آپ سے ملیے۔ آپ ہیں سعید صاحب، ہمارے بھائی جان۔" سیما نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"لیکن چڑیا گھر تو شام کے وقت کُھلتا ہے۔" ہم نے اُن کو ٹالتے ہُوئے کہا۔

"تو کیا ہُوا!" سیما بولی۔ "ہم باغِ جناح ہی دیکھ آئیں گے۔"

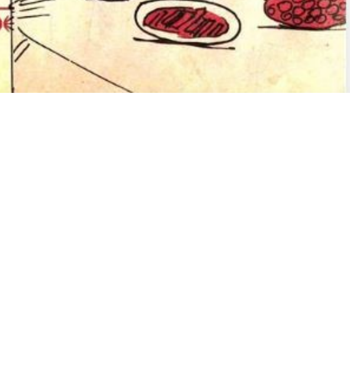


اری رینو! سچّ کہتی ہُوں۔ چڑیا گھر تو تُو نے کراچی میں بھی دیکھا ہو گا، مگر جناح باغ سے اچھّا باغ تو تُو جنّت ہی میں دیکھے گی جا کر۔ چُونکہ ابھی تیرے مرنے میں بہت دن باقی ہیں، اِس لیے لگے ہاتھوں دیکھ ہی لے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے، ابھی چلتے ہیں۔ اُٹھیے بھائی جان!" رینو چائے کی پیالی رکھتے ہُوئے بولی۔

"ارے بھئی، ایسی بھی کیا جلدی ہے!" ہم نے کہا۔"سب ساتھ چلیں گے۔ دو ایک دن ٹھہر جاؤ۔ ممانی جان اور امّی جان بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔"

"میَں کہتی ہُوں بھائی جان!" رسیما بولی۔ "آپ اِتنے ڈرپوک کیوں ہیں؟ ماشاء اللہ چودہ سال کے ہو گئے ہیں۔ روزانہ چھ سات روٹیوں کا خُون کر ڈالتے ہیں، آدھ سیر پکّا دُودھ بھی ڈکار جاتے ہیں اور اگر خالہ جان کی نظر بچے تو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک گھی بھی سالن میں ڈال لیتے ہیں۔ اِس پر بھی یہ حال ہے کہ جناح باغ



امّی جان کے ساتھ جائیں گے۔"

"آپ دیکھ رہی ہیں امّی جان؟" ہم نے بھنویں چڑھا کر امّی جان کی طرف دیکھا۔

"امّی جان کیا دیکھیں گی؟" سیما بولی۔ "مُنہ صاف کیجیے انڈا لگا ہے اور بتائیے کہ آپ ڈرپوک ہیں یا نہیں؟"

"ہرگز نہیں ——!" ہم اُٹھتے ہُوئے بولے۔

"تو پھر آپ ہمیں جناح باغ دکھانے کے لیے کیوں نہیں لے جاتے؟" اس نے پُوچھا۔

"میَں تو بالکل تیّار ہُوں۔" ہم نے کہا۔ "مگر مُمانی جان اور امّی جان بھی ساتھ چلتیں تو ذرا مزہ رہتا۔"

امّی جان ہماری باتیں سُن رہی تھیں۔ ہاتھ ہلا کر بولیں:

"ارے بیٹے! مَیں نے بہُت دیکھے ہیں چڑیا گھر۔ مُوئے کوّے بیٹھے کائیں کائیں کرتے ہوتے ہیں اور کیا —— رکھا ہوتا ہے وہاں۔ جاؤ تم تینوں جا کر دیکھ آؤ، مگر زیادہ دیر نہ لگانا۔"



رینو اور سیما جھٹ پٹ کپڑے پہن کر تیّار ہو گئیں۔ مُمانی جان نے رینو کو ہدایت کرتے ہُوئے کہا :

"بیٹی ! کپڑوں کا خیال رکھنا۔ یہی کپڑے پہن کر شام کو تمھیں انور بھائی کے ہاں جانا ہے۔ اِتنے کپڑے مَیں نہیں لائی ہُوں کہ تُم دن میں تین تین جوڑے بدلو۔"

"بہت اچھا امّی !" رینو نے وعدہ کیا۔

ہم چوک سے بس میں بیٹھے اور پلازا سینما پر جا کر اُتر گئے۔ جناح باغ میں اِتنی رونق نہیں تھی جتنی شام کے وقت ہوتی ہے۔ کہیں کہیں کوئی اِکّا دُکّا آدمی نظر آ جاتا تھا۔ گلستانِ فاطمہ سے ہوتے ہُوئے ہم منٹگمری ہال کی طرف گئے۔ یہاں دو سپاہی اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ سیما بولی : ———

"چلو بھائی جان ! پہلے پہاڑی کی سیر کرتے ہیں۔ پھر بچّوں کے پارک میں جا کر جھولا جھُولیں گے۔"

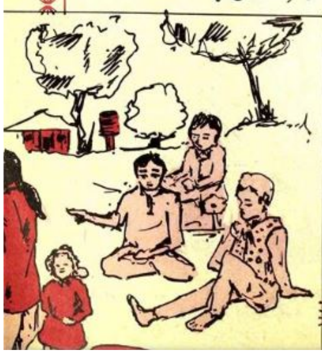
ہمارا خیال تھا کہ پہاڑی بھی سُنسان ہو گی، مگر وہاں تین لڑکے بنچوں پر لیٹے فلمی گانے گا رہے



تھے۔ ہم سے ذرا ہی بڑے ہوں گے۔ مَیلے کچیلے اور پھٹے پُرانے کپڑے، بالوں میں مٹّی اَٹی ہُوئی، گلوں میں رُومال بندھے ہُوئے اور صورتوں پر ایسا پکّا پَن جیسے یہ بچّے نہیں بلکہ کئی بچّوں کے باپ ہیں۔ تینوں لڑکے ایک ہی سگریٹ باری باری پی رہے تھے۔ ہم بنچوں کے پاس کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگے :

"کِتنا خُوب صُورت منظر ہے !" رینو نے جھُوم کر کہا۔

"پاکستان میں اِس سے زیادہ خُوب صُورت اور کوئی باغ نہیں۔" سیما بولی۔ "یہ آج سے سو سال پہلے لارڈ لارنس نے بنوایا تھا، اِس لیے اُسی کے نام پر "لارنس گارڈن" مشہور ہُوا۔ پھر جب پاکستان بنا تو اس کا نام بدل کر "جناح باغ" رکھ دیا گیا۔ اِس باغ میں جو پہاڑیاں ہیں، وہ کِسی زمانے میں اِینٹیں پکانے کے بھٹّے تھے......"



"یار ! لڑکی تو بڑی ہوشیار ہے۔ کیوں بے دینو !" اُن میں سے ایک لڑکے نے کہا، اور مُنہ سے طبلہ بجانے لگا۔

"کِسی اسکول کی ماسٹرنی معلوم

ہوتی ہے۔" دُوسرے لڑکے نے جواب دیا، اور ناک سے سارنگی بجانے لگا۔

"اور یہ جو صاحب بہادر ہیں، یہ کسی لاٹ صاحب کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔" تیسرا بولا اور بکرے کی طرح بو بو کرنے لگا۔

"بڑے بدتمیز لڑکے ہیں!" رینو نے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو بھئی، آؤ چلیں یاں سے!" ہم نے سیما اور رینو کا بازو پکڑ کر آہستہ سے کہا۔

"ارے یار ٹھہرو، کہاں چلے! کچھ دیر تو بیٹھو۔ کیا خاطریں کریں تمھاری؟" ایک لڑکا دانت نکال کر بولا۔" جا بے کرمو! نیچے ہوٹل والے سے کہنا دو درجن سموسے گرما گرم بھیج دے۔ میرا نام لینا۔"



"میاں! تمھاری طبیعت تو اچھّی ہے؟" ہم نے کہا۔" خواہ مخواہ گلے پڑ رہے ہو۔ یہ تو وُہی بات ہُوئی کہ آ بَیل! مجھے مار۔"

"بدتمیز! نالائق!!" سیما نے

غصّے سے گھورتے ہوئے کہا۔

اُن میں سے ایک لڑکا، جس نے پھُول دار واسکٹ پہنی ہُوئی تھی، ایک خاص انداز سے اپنے بنچ سے اُٹھا، واسکٹ کی جیبوں میں انگوٹھے ڈال لیے، گردن کو دائیں طرف جھٹکا دیا تو بال بکھر کر ماتھے پر آن پڑے۔ وہ بڑے پُراسرار انداز سے آہستہ آہستہ سیما کی طرف بڑھا اور ہونٹ نکال کر بولا :

"کیا کہا ___؟ نالائق؟ ___ اری، تیری یہ مجال ___ کہ تُو دلیپ کمار کو بدتمیز اور نالائق کہے! گھنگھور گھٹاؤں میں کڑکتی ہُوئی بجلیوں کی قسم! تُو عورت ذات ہے ___ جا معاف کیا ___ اگر تیری جگہ کوئی مرد ہوتا، تو میرے غضب سے آکاش کانپ جاتا، یہ زمین چیخ اُٹھتی، چلاّ اُٹھتی ___!"



"واہ بے لنگڑو!" ایک لڑکا تالیاں بجا کر بولا۔" اوئے تم نے تو کمال کر دیا، ایمان سے! ابے بالکل دلیپ کمار کی سی ایکٹنگ کی اِس وقت تو۔"

پہلے تو جی میں آئی کہ گھونسا مار

کر اِن دلیپ کمار صاحب کو ممبئی پہنچا دیں۔ پھر سوچا کہ یہ تو تین ہیں اور ہم ایک۔ جھگڑا بڑھا تو نقصان ہمارا ہی ہے، اِس لیے ہم بڑے پیار اور نرمی سے بولے :

"بھائی! آپ خفا کیوں ہوتے ہیں؟ اگر آپ کو ہمارا یہاں کھڑا ہونا اچھا نہیں لگتا تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ایک بُزدل اور کر بھی کیا سکتا ہے؟" وہ لڑکا اپنے سَر کو جھٹکا دے کر بولا۔" ارے! ہمارے سامنے تو بڑے بڑے سُورما نہیں ٹھہر سکے۔ تُو کیا چیز ہے؟ —— آخ تھُو......" یہ کہہ کر اُس نے زمین پر تھُوک دیا۔

ہم کھڑے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کہ اُس نے آگے بڑھ کر ہمیں زور سے دَھکّا دیا اور ہم لڑکھڑا کر بنچ پر گر پڑے۔ ابھی ہم جوابی حملہ کرنے کے لیے اُٹھ ہی رہے تھے کہ سِیما نے اُس کا کالر پکڑ کر عَین ٹھوڑی کے نیچے اِس زور کا مُکّا رسید کیا کہ وہ لُڑھکنیاں کھاتا ہُوا سیڑھیوں پر گر پڑا۔ اب



ہم نے بھی جلدی سے بنچ سے چھلانگ لگائی اور ایک لڑکے کے پیٹ پر اِتنی زور دار لات جمائی کہ وہ بھی لُڑھکتا پڑختا نیچے دُور تک چلا گیا۔ اِس کے بعد ہم تیسرے لڑکے کی طرف جھپٹے جو بنچ پر کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا :

"ارے رے رے! مَیں تو کُچھ بھی نہیں کہہ رہا تم سے۔ لڑ تو وہ رہے تھے۔"

ہم نے سوچا، چلو اِس نے تو ہار مان لی، اِسے کیا ماریں —— لیکن ابھی ہم نے اس کی طرف سے پیٹھ موڑی ہی تھی کہ اس نے پیچھے سے ہمارے اس زور کی لات ماری کہ ہم اوندھے مُنہ زمین پر گر پڑے۔ یہ دیکھ کر سِیما نے بجلی کی سی تیزی سے دوپٹّا اُتارا اور پیچھے سے اس کی گردن میں ڈال کر دونوں ہاتھوں سے جھٹکا دیا تو وہ قلابازی کھا کر سَر کے بَل نیچے آ گرا۔

اِتنے میں وُہ دونوں لڑکے بھی لوٹتے پوٹتے اُوپر آ چکے تھے۔ اب اِن دو ہی سے ہمارا مُقابلہ تھا کیونکہ تیسرا تو گردن پکڑے ہائے اللہ



اور ہائے اماں کر رہا تھا۔ ہم بھی سنبھل کر کھڑے ہو چکے تھے۔ دلیپ کمار صاحب دانت پیستے ہوئے ہماری طرف بڑھے، کہ اچانک سیٹیوں کی آواز آئی اور وہ سپاہی جو منٹگمری ہال کے پاس کھڑا تھا اُوپر چڑھ آیا۔ سپاہی کو دیکھ کر ان شیطانوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ قلانچیں مارتے ہوئے نیچے بھاگ گئے۔

"بھاگ گئے شیطان!......" سپاہی نے کہا۔ "ورنہ ایسا مزہ چکھاتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی یہ نیچے منٹگمری ہال کے سامنے بیٹھے گندے گندے گانے گا رہے تھے۔ وہاں سے میں نے انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگایا —— اب یہاں آکر تمھیں تنگ کرنے لگے۔"

"یہ ہم سے خواہ مخواہ لڑ رہے تھے۔ ہم یہاں سیر کرنے آئے ہیں۔" ہم نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"مگر میاں تم اکیلے کیوں آئے؟" سپاہی بولا۔ "اور وہ بھی صبح کے وقت جب کہ یہاں بہت کم لوگ آتے جاتے ہیں۔ یہ لو بی بی اپنا دوپٹا۔ مٹی میں اَٹ گیا ہے۔ اوہو! تمھاری



تو قمیض بھی پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔" اس نے اپنی جیب سے سیفٹی پن نکالی اور سیما کی پیٹھ پر پھٹی ہوئی قمیض کے دونوں حصّے ملا کر لگا دی۔ "اب ٹھیک ہے....... اُوپر سے دوپٹّا اوڑھو گی تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ آؤ! نلکے پر ہاتھ مُنہ دھو لو۔ بھُتنے بنے ہوئے ہو۔"

اِسی پہاڑی پر پانی کی ایک ٹنکی بھی ہے۔ اُس کے نیچے نلکا لگا ہوا ہے۔ وہاں ہم نے ہاتھ مُنہ دھویا اور پھر یکایک کوئی کھوئی ہوئی چیز یاد آگئی۔

"سیما! رینو کہاں ہے؟" ہم نے گھبرا کر پُوچھا۔

سیما نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ آنکھوں سے ڈر اور خوف جھلکنے لگا۔ وہ ایک دم چیخ اُٹھی :

"رینو! تم کہاں ہو——؟"

ٹنکی کے نیچے سے آواز آئی :

"مَیں یہاں ہُوں باجی!—— لڑائی ختم ہو گئی؟"

"ارے! تم اندر چھُپی بیٹھی ہو؟"



سیما نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

رنبو سُکڑی سِمٹی ، دبی لچکی باہر نکلی ۔ اُس نے گھوم پھر کر اپنے کپڑوں کو دیکھا اور بولی :

" امّی جان نے کہا تھا ، کپڑے خراب مت کرنا ، کیوں کہ یہی کپڑے پہن کر انور بھائی کے ہاں جانا ہے ۔"

" شاباش !" سپاہی ہنس کر بولا ۔" فرمانبردار اولاد ہو تو تم جیسی ہو۔ بہن بھائیوں کو پِٹوا دیا ، مگر ماں سے کیا ہُوا وعدہ نہیں توڑا ۔ ہاہاہا !—— آؤ ! مَیں تمھیں باغ کے دروازے تک چھوڑ آؤں ۔ وہاں سے تانگے میں بیٹھ کر گھر چلے جانا ۔"

" کیسے وحشی اور جنگلی لڑکے تھے ۔" جب ہم پہاڑی پر سے نیچے اُتر آتے ، تو سیما نے کہا ۔



" بیٹی ! ایسے بچّے زمین کا بوجھ اور انسانیّت کے مُنہ پر کالک ہیں ۔" سپاہی بولا ۔" ان کا لڑکپن یونہی آوارہ گھومتے اور سینما دیکھتے گزرے گا ۔ جب یہ بڑے ہوں گے تو کوئی چور بنے گا اور کوئی ڈاکو۔

ساری زندگی جیل خانوں میں گزُرے گی اور پھر ایک دن اِسی طرح مرجائیں گے ، جیسے کیڑے مکوڑے مرجاتے ہیں ۔"

" یہ سب ان کے ماں باپ کا قصُور ہے ۔" ہم نے کہا ۔

" ایسا مت کہو ۔" سپاہی بولا " اُن بے چاروں کو تو روزی کمانے ہی سے فرصت نہیں ملتی ، وہ اولاد کی دیکھ بھال کیسے کریں ؟ اور پھر ایک ہو ، دو ہوں ، تین ہوں تو کوئی ڈھنگ سے ، سلیقے سے انھیں پالے پوسے ، تعلیم دلائے ، ہُنر سکھائے ، جہاں تعداد درجن تک پہنچتی ہو وہاں کوئی کہاں تک ان کی طرف توجّہ دے سکتا ہے اس لیے میرے بچّو ! ماں باپ کی طرف مت دیکھو ۔ تم خُود ہی اپنی زندگی بناؤ ۔ جی لگا کر تعلیم حاصل کرو ، ایسے ہُنر سیکھو کہ تمھاری زندگی آرام سے گزُرے ۔ کیونکہ اگر تم خوش حال ہو گئے تو تمھارا مُلک بھی خوش حال ہو گا ۔"



" لیکن مُلک کے سارے بچّے کیسے تعلیم حاصل کر سکتے اور ہُنر سیکھ سکتے ہیں ؟" سیما نے کہا ۔" ہمارا ملک بہت غریب ہے ۔ یہاں زیادہ تر ایسے لوگ بستے ہیں جو اپنی اولاد کو نہ تو

تعلیم دلا سکتے ہیں اور نہ کوئی ہُنر ہی سکھا سکتے ہیں۔"

"میں تمھیں بتاتا ہُوں۔" سپاہی نے کہا۔ "تم پڑھے لکھّے بچّے ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ امریکا اور یورپ کے مُلک دُنیا میں سَب سے زیادہ ترقی یافتہ اور خوش حال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا ہر شخص پڑھا لِکھّا اور ہُنر مند ہے۔ غریب لوگ وہاں بھی بَستے ہیں لیکن اُن کے بچّے ہمارے بچّوں کی طرح گلی کُوچوں میں آوارہ نہیں گھُومتے پھِرتے۔ وہ لوگوں کے گھروں، ہوٹلوں اور دکانوں میں کام کرتے ہیں، اور فرصت کے وقت کسی سکول یا صنعتی درس گاہ میں جاکر پڑھتے اور ہُنر سیکھتے ہیں، اُن میں سے کوئی انجینئر، کوئی وکیل اور کوئی سائنس دان بنتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی زندگی بنانے کے ساتھ ساتھ مُلک و قوم کا نام روشن کرتے ہیں۔

اے تانگے والے! ٹھہرو!" سپاہی نے تانگہ رُکوا یا۔ جب ہم تانگے میں بیٹھ گئے تو کانسٹیبل کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے سیمانے کہا کہ اگر آپ نہ آتے تو اس وقت ہم ہسپتال میں ہوتے۔"



"اور میَں کہاں ہوتی؟" رینونے کہا۔

"ٹنکی کے نیچے۔" سیمانے جواب دیا۔

اور ہم سب ہنس پڑے۔

●●

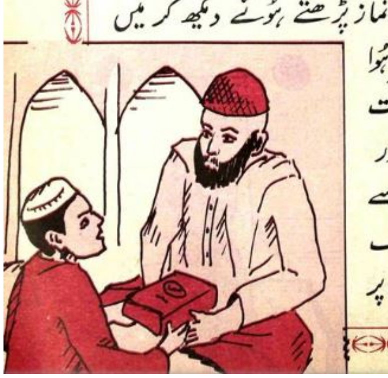
ڈاکٹر محمد باقر

بچپن کی یادیں

بچّو! بچپن کی یاد بڑی سُہانی ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بچپن میں سارا وقت صرف خوشیوں ہی میں نہیں کٹتا، لیکن جب آدمی بڑا ہو جاتا ہے تو اُس وقت اُسے صرف یہی یاد رہ جاتا ہے کہ اس کا بچپن کا زمانہ کتنا خوب صورت اور سُہانا تھا، کاش! بچپن دوبارہ واپس لوٹ آئے۔

مثلاً، مجھے یہ ابھی تک یاد ہے :

اپنی گلی کے تمام لوگوں کو نماز پڑھتے ہُوئے دیکھ کر میں خود امام مسجد کے پاس حاضر ہُوا اور میں نے اُن سے درخواست کی کہ آپ مجھے بھی قرآن اور نماز پڑھائیے۔ میں نے اِسے بہت اچھا کام سمجھا اور اب تک سمجھتا ہُوں اور آج تک اس پر

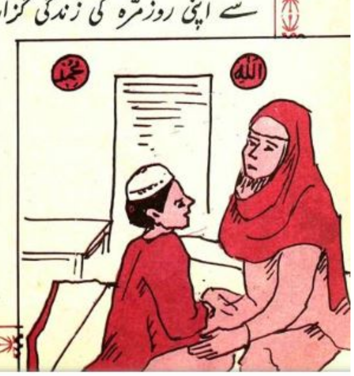


باقاعدگی سے عمل کر رہا ہوں۔

اچھے کام کی بات آئی ہے تو یہ بتانا بہت مناسب ہو گا کہ جن لوگوں نے بچپن میں میری زندگی پر اچھے اور خوشگوار اثرات ڈالے، اُن میں میری والدۂ محترمہ، میری نانی اماں اور میرے محترم استاد تھے۔

میری نانی اماں بیوہ تھیں، لیکن اللہ تعالےٰ نے اُنھے کو ایمان کی دولت اور قناعت اِس قدر دی تھی کہ وہ ساری عمر خدا کے سہارے کے سوا کِسی اور کی محتاج رہ کر نہ جئیں۔

میری نانی اماں ایک چھوٹے سے زمیندار کی بیوی تھیں۔ اس لیے وہ زمیندارہ طریق پر بڑی محنت کرتیں اور عِزّت آبرو سے اپنی روزمرّہ کی زندگی گزارتیں۔



مَیں نے اُن کی عملی زندگی سے یہ سبق حاصل کیا ہے، کہ قناعت اور عِزّت سے زندگی بسر کرنا بڑی اچھی بات ہوتی ہے۔

میری والدۂ محترمہ نے بھی عملی طور پر اپنے رہن سہن سے مجھے

یہ سکھایا کہ جھوٹ بولنا اور چوری کرنا بہت بُری باتیں ہیں۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اور بڑی خدا پرست ہیں۔

میری والدۂ محترمہ پر جب بھی کبھی کوئی مصیبت آتی، تو کئی لوگ انھیں یہ مشورہ دیتے کہ آپ فلاں پیر کے پاس چلی جائیں اور تعویذ لے آئیں۔ لیکن وہ اِس پر کبھی آمادہ نہ ہوئیں۔ وہ مشکل وقت میں ہمیشہ قرآن مجید کا مُطالعہ کرتیں۔ نفل پڑھتیں۔ اور خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر دعا مانگتیں۔ مَیں نے دیکھا کہ اُن کی دعا اکثر قبول ہوتی۔

مَیں نے بھی اپنی والدہ کی اس عادت سے یہ اثر لیا، کہ پیروں فقیروں سے تعویذ لینے کی بجائے محنت اور دُعا سے بہت سی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔



میرے ایک ہندو اُستاد نے ہمیشہ پاکیزگی کی تعریف کی اور عملی طور پر اپنے آپ کو ہمیشہ ہر لحاظ سے ہمارے سامنے ایک پاکیزہ انسان کی شکل میں پیش کیا۔ اِس ہندو استاد کی پاکیزہ زندگی نے

میرے دل میں پاکیزگی کا احترام پیدا کیا، اور یہ جذبہ ہمیشہ آج تک میری راہنمائی کرتا آ رہا ہے کہ آدمی جو کچھ بھی کرے، لیکن کسی بھی صورت میں ناپاک زندگی بسر نہ کرے۔ کیوں کہ اِس سے انسانیت کو دُکھ پہنچتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں۔ جن کی بُری زندگی کے نمونے نے ڈرا کر نیکی کے راستے پر چلنے میں مدد دی۔

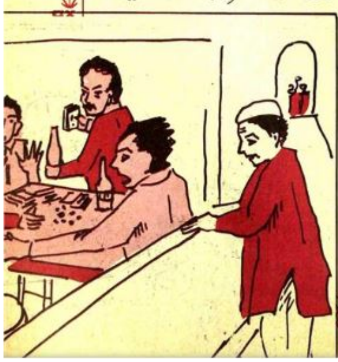
میرے بچپن کے سکول کی دیوار کے ساتھ ایک جُوا خانہ تھا، جس میں لوگ بھنگ اور شراب بھی پیتے تھے۔ مَیں کبھی کبھی سکول سے فارغ اوقات میں اس جُوئے خانے میں جا نِکلتا اور دیکھتا کہ لوگ بڑی آسانی سے روپیہ جیت اور ہار رہے ہیں۔ جو لوگ روپیہ جیت جاتے، وہ فوراً ہی شراب اور بھنگ پر خرچ کر ڈالتے اور جو ہار جاتے، وہ جیتنے والوں کو بے تحاشا گالیاں دیتے اور کبھی کبھی تو چاقو نکال کر اُن پر حملہ کرنے کی کوشش بھی کرتے۔



میں اس وقت ڈر کر جُوئے خانے سے بھاگ آتا۔

بچپن میں دیکھے ہُوئے اِس منظر نے مجھے ہمیشہ جُوئے اور نشے سے دُور رکھا ہے۔ مجھے چاہے کوئی کتنا بھی لالچ دے اور یقین دلائے کہ جُوا کھیلنے یا شرط لگانے سے روپیہ آسانی سے کمایا جا سکتا ہے، مَیں کبھی اِس لالچ میں نہیں آتا۔ یہاں تک کہ دو چار آنے کا داؤ لگانے سے بھی انکار کر دیتا ہُوں۔ اس طرح مجھے نشوں سے بچپن میں ہی اِس قدر نفرت پیدا ہُوئی کہ آج تک اِن کو ہاتھ نہیں لگایا۔

ہمارے بچپن کے زمانے میں بڑے بوڑھوں کی بڑی عزت اور ادب و احترام کیا جاتا تھا۔ آج کل لوگ صرف امیر آدمیوں کی عزّت کرتے ہیں، لیکن ہم نے بچپن میں ایسے غریب دیکھے ہیں۔ جن کی لوگ اِس لیے عزت کرتے تھے کہ وہ بہت نیک اور عقل مند آدمی ہوتے تھے اور اُن کی عمر دوسروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ گاؤں کی ہر مجلس اور محفل میں لوگ انھیں عزّت کی جگہ دیتے تھے۔



اور مشکل وقت میں اُن سے مشورہ لینے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

ان بزرگوں کا بھی یہ رویّہ ہوتا تھا کہ وہ دولت جمع کرنے کی بجائے لوگوں کی مفت خدمت کرتے تھے، بلکہ چھوٹے اور ناسمجھ بچّوں کو مشورہ مانگنے کے بغیر مشورہ دیتے تھے اور انھیں نصیحت کرتے تھے تاکہ ان کی بھلائی ہو۔

ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ تھے، وہ بہت نیک اور رحمدل تھے، ایک دن وہ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے :

"سچ بتاؤ، حُقّہ پیتے ہو؟"

میرے ایک ہم جماعت نے چند دن ہی پہلے مجھے حقّے کی عادت ڈالی تھی۔ ہمارے زمانے میں سگریٹ کا رواج نہیں تھا۔ مَیں کچھ دیر تو سہم کر کھڑا رہا، لیکن پھر حوصلہ بڑا کر کے مَیں نے کہہ ہی دیا :

"جی....!"



مسکرا کر کہنے لگے :

"حُقّہ پینے سے بچّوں کا دل جل جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت نازک ہوتا ہے۔ تم اپنا دل کیوں جلا رہے ہو؟"

اور یہ کہہ کر وہ چل دیے۔

مَیں گھر آ کر سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بزرگ گاؤں میں بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے غلط بات نہیں کہی، اُن کی بات میرے دل میں گھر کر گئی اور وہ بزرگ مجھے پہلے سے اچھّے لگنے لگے۔

چنانچہ اُسی دن سہ پہر کا وقت تھا، مَیں گھر میں اسکول سے ملا ہُوا کام کر رہا تھا کہ میرا وہی دوست جس نے مجھے حُقّے کی عادت ڈالی تھی، حُقّہ پینے کی دعوت دینے کے لیے آیا، تو مَیں نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

وہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا، اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتا رہا لیکن مَیں نہیں گیا۔

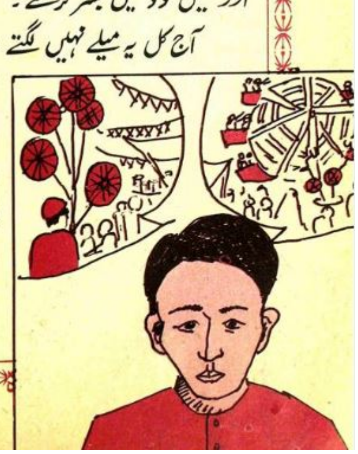


پھر ہندوستان ، پاکستان اور یورپ کے کئی مُلک اور شہر گھُومتے ہُوئے سینکڑوں آدمیوں نے مجھے حُقّہ اور سگریٹ پینے کی دل کش دعوت دی لیکن مَیں اس کے قریب بھی نہیں گیا۔ بس میرے دل میں یہی خیال جم گیا کہ سگریٹ پینے کی وجہ سے واقعی دل جلتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں بہت سے میلوں کی یادیں بھی محفوظ ہیں۔ جن میں بیساکھی کا میلہ خاص طور پر دلچسپ ہوتا تھا۔

ہم اِس میلے میں کئی کئی مِیل پیدل چل کر پہنچتے ، اور پھر سارا دن کھانے پینے ، اِدھر اُدھر گھُومنے پھرنے اور سَیر کرنے اور کھیل کُود میں بسَر کرتے۔

آج کل یہ میلے نہیں لگتے ، جن میں بہت سے بچّے شامل ہو کر خوشیاں منائیں۔ اِس سے زندگی اداس ہو گئی ہے۔ میرا اب بھی ایسے میلوں میں شریک ہونے کو جی چاہتا ہے۔ شاید یہ میرے بڑھاپے کا اثر ہے کہ لوگ کہتے ہیں ، بُوڑھا آدمی بچّہ بن جاتا ہے ۔



صُوفی تبسّم

عبدالرحیم خانِ خاناں

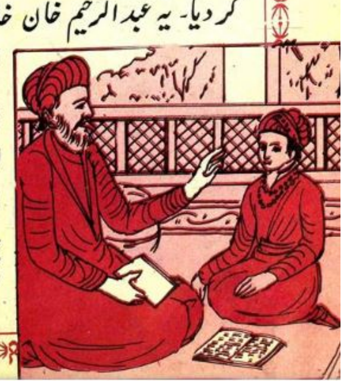
مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دربار میں نو بڑے بڑے وزیر تھے۔ اُن میں ہر ایک اپنے اپنے فن کا ماہر تھا۔ دُنیا بھر میں اُن کے عِلم و فضل اور عقل و دانشمندی کا چرچا تھا۔ وہ دربار میں بادشاہ کے نورتن کہلاتے تھے۔

اُنہی نورتنوں میں ایک عبدالرحیم خانِ خاناں بھی تھے۔ عبدالرحیم خانِ خاناں ، بیرم خان کے بیٹے تھے۔ جب اکبر کا باپ ہمایوں بادشاہ نے وفات پائی تو اس وقت اکبر ابھی بہت کم عمر تھا۔ بیَرم خان نے اکبر کو تخت پر بٹھایا اور حکومت کا کام کاج چلانے میں بڑی مدد کی۔ اکبر بڑا سمجھدار ، ہوشمند ، اور دُور اندیش آدمی تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں سلطنت



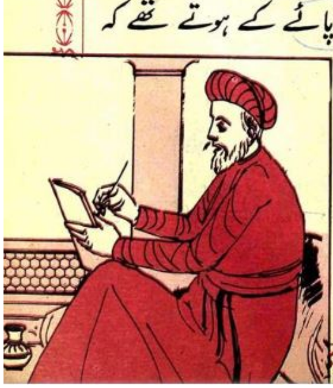
کا سارا کاروبار سنبھال لیا اور بیرم خان سے سارے اختیارات چھین لیے۔ بیرم خاں اس رویّے سے بہت آزردہ ہُوا اور حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں کسی دشمن نے اس پر حملہ کر کے اُسے مار ڈالا۔ عبدالرحیم اس وقت ایک ننّھا سا بچّہ تھا۔ اُس کی جان بچ گئی۔ ماں اُسے لے کر اکبر کے دربار میں آئی۔ اکبر کو بیرم خان کی پُرانی خدمتیں یاد آئیں۔ اُس نے عبدالرحیم کو بڑے پیار سے پالا۔

عبدالرحیم بڑا ہو کر اپنے باپ کی طرح ایک بہُت بہادر سورما سپاہی بن گیا۔ اُس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اکبر نے اُس کی قابلیّت کو دیکھ کر اپنے بیٹے جہانگیر کا اتالیق مقرر کر دیا۔ یہ عبدالرحیم خان خاناں ہی کی تعلیم و تربیّت کا نتیجہ تھا کہ جہانگیر کو قلم اور فن کا شوق پیدا ہُوا اور اُس نے بڑے ہو کر اپنی زندگی کے حالات بڑی خوبصورتی اور پیارے انداز میں لکھے۔ یہ بہت مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کا نام "تزکِ جہانگیری" ہے۔



عبدالرحیم خانِ خاناں جس طرح تلوار کا دھنی تھا، اُسی طرح قلم کا دھنی بھی تھا۔ شہنشاہ اکبر اُسے جس جگہ بھی بھیجتا، وُہ اپنے پاس بڑے بڑے عالم، فاضل لوگوں کو جمع کر لیتا۔ شاعروں کو اپنی مجلس میں بُلاتا اور اُن کی خدمت کرتا، اور انھیں انعام و اکرام سے نوازتا۔

جب عبدالرحیم خانِ خاناں گجرات (کاٹھیاوار) کا حاکم بن کر گیا تو اُس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے شاعروں کو بُلا لیا۔ عبدالرحیم خود بھی شاعر تھا اور تین زبانوں فارسی، ترکی اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اس نے بابر بادشاہ کی لکھی ہوئی سوانح عمری کا، جس کا اصلی نام "بابر نامہ" تھا، ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کے فارسی شعر اس پائے کے ہوتے تھے کہ فارسی کے بڑے بڑے اُستاد شاعر اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس کی ہندی شاعری کا ہندی زبان میں بڑا اُونچا درجہ دیا گیا ہے۔ ان کا ہندی کلام آج تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔



عبدالرحیم خانِ خاناں جتنا قابل تھا اُتنا ہی سخی بھی تھا۔ وہ بات بات پر دھن لُٹاتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے دربار کے ایک شاعر، نظیری نے اُس سے کہا :

" مَیں نے لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا۔"

عبدالرحیم خانِ خاناں نے اُس کو کہا :

" شام کو تم میرے گھر آ جانا۔"

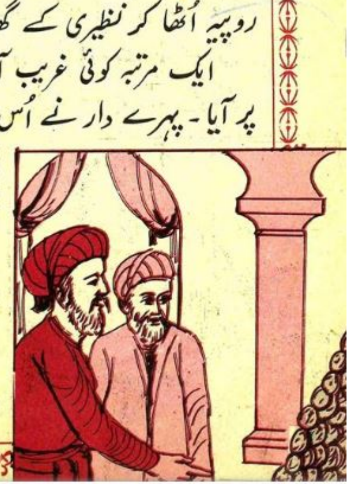
شام کو نظیری نے اُس کے گھر جا کر لاکھ روپے کا ڈھیر دیکھا اور شعر لِکھ کر شکریہ ادا کیا۔ خانِ خاناں نے وُہ لاکھ روپیہ اُٹھا کر نظیری کے گھر بھجوا دیا۔

ایک مرتبہ کوئی غریب آدمی اس کے محل کے دروازے پر آیا۔ پہرے دار نے اُس کے پھٹے پُرانے کپڑے دیکھ کر اُسے اندر آنے سے روک دیا۔

اُس شخص نے کہا :

" مجھے مت روکو، مَیں عبدالرحیم خانِ خاناں کا قریبی رشتہ دار ہُوں۔"

پہرے دار نے اندر جا کر سارا ماجرا بیان کیا۔ خانِ خاناں نے



اُس آدمی کو اندر بُلا کر بڑی عزّت سے اپنی مسند پر بٹھایا، اور پھر باتوں باتوں میں رشتے کی بات چھیڑی۔

اُس شخص نے خانِ خاناں کو جواب دیا :

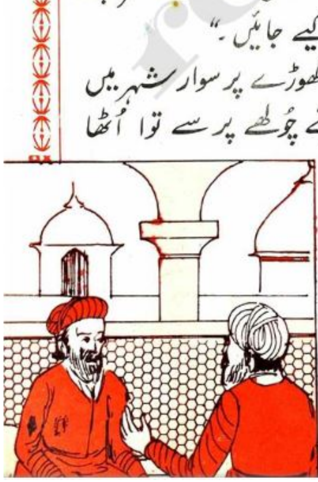
"غریبی اور امیری دو بہنیں ہیں۔ امیری کی شادی تم سے ہُوئی ہے اور غریبی کی مُجھ سے۔ ہم دونوں ہم زلف ہیں۔"

عبدالرحیم خانِ خاناں اِس رشتہ داری کے تعلق کو سُن کر بہت خوش ہُوا۔ پھر حکم دیا :

"جب تک یہ شخص زندہ ہے، اس کے سارے اخراجات میرے ذاتی خزانے سے پُورے کیے جائیں۔"

ایک دن عبدالرحیم خانِ خاناں گھوڑے پر سوار شہر میں سے گُزر رہا تھا۔ ایک بُڑھیا اپنے چُولھے پر سے توا اُٹھا لائی اور لوگوں کے ہجوم میں سے گُزر کر آگے بڑھی اور پھر توے کو خانِ خاناں کے لباس سے رگڑنا شروع کیا۔

لوگوں نے اُسے دیوانی سمجھ کر پکڑ لیا اور ہجوم میں سے باہر لے



اُس آدمی کو اندر بُلا کر بڑی عزّت سے اپنی مسند پر بٹھایا ، اور پھر باتوں باتوں میں رشتے کی بات چھیڑی۔

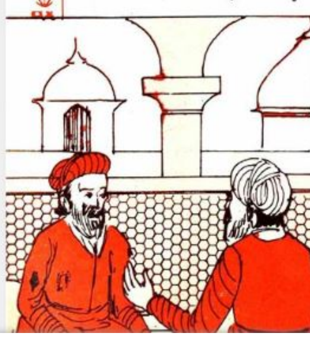
اُس شخص نے خانِ خاناں کو جواب دیا :

"غریبی اور امیری دو بہنیں ہیں ۔ امیری کی شادی تم سے ہُوئی ہے اور غریبی کی مجھ سے ۔ ہم دونوں ہم زلف ہیں۔"

عبدالرحیم خانِ خاناں اِس رشتہ داری کے تعلق کو سُن کر بہت خوش ہُوا ۔ پھر حکم دیا :

"جب تک یہ شخص زندہ ہے ، اس کے سارے اخراجات میرے ذاتی خزانے سے پُورے کیے جائیں ۔"

ایک دن عبدالرحیم خانِ خاناں گھوڑے پر سوار شہر میں سے گزر رہا تھا ۔ ایک بُڑھیا اپنے چُولھے پر سے توا اُٹھا لائی اور لوگوں کے ہجوم میں سے گزُر کر آگے بڑھی اور پھر توے کو خانِ خاناں کے لباس سے رگڑنا شروع کیا ۔



لوگوں نے اُسے دیوانی سمجھ کر پکڑ لیا اور ہجوم میں سے باہر لے

جانے لگے ۔ خانِ خاناں نے کہا :

"ٹھہرو ! اسے میرے پاس لاؤ ۔" بڑھیا پاس آئی ، تو عبدالرحیم خانِ خاناں نے پُوچھا : "یہ تم نے کیوں کیا ؟"

بُڑھیا نے جواب دیا :

"مَیں نے سُنا ہے کہ اگر لوہا کسی خوش نصیب آدمی کو چھُو لے تو وہ سونے میں بدل جاتا ہے ۔"

خانِ خاناں ہنس پڑا ۔ اُس نے حکم دیا کہ توے کو سونے میں تول کر بُڑھیا کو دے دیا جائے ۔

اکبر بادشاہ نے عبدالرحیم خانِ خاناں کی یہ سخاوتیں دیکھ کر اُسے منعم خان کا لقب دیا تھا ۔

شہنشاہ اکبر کی سلطنت جاتی رہی ، لیکن عبدالرحیم خان خاناں کا علم وفضل اور اس کی بے پناہ فیاضیوں اور سخاوتوں کی داستانیں آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں ۔

عِلم ایک ایسی دولت ہے ، جو خرچ کرنے سے اور بڑھتی ہے ۔

